R. No. 2186/57 Regd. No. L. 922.

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

تاریخ اشاعت ۲۲-۱۵-۰-۱

ٹیلیفون — ۹۹
قیمت فی پرچہ
سالانہ روپے

جلد ۲۴ - نمبر ۲ | ایڈیٹر، آل احمد سرور | ۸-جنوری ۱۹۶۵ء

اداریہ

اتر پردیش کی سرکار سے

اتر پردیش کو کچھ لوگ الٹا پردیش کہتے ہیں یہاں اب گنگا الٹی بہنے لگی ہے۔ ان سترہ برسوں میں بہت سی ریاستوں نے نمایاں ترقی کی ہے مگر اتر پردیش جہاں تھا وہیں ہے۔ اتر پردیش کی حکومت کے ارکان میں اکثر اختلافات رہتا ہے کبھی ایک گروہ طاقت ور ہو جاتا ہے کبھی دوسرا۔ یہاں کی سرکار کو ریاست کی تہذیبی زندگی، اس کی روایات، اس کی خصوصیات کا پورا احساس نہیں ہے۔ اردو اس ریاست میں ایک خاص مقام رکھتی ہے۔ آج اتر پردیش کی جو بھی تہذیب ہے جس کے لیے وہ ہندوستان میں مشہور ہے، اس میں اردو کا ایک خاص حصہ ہے۔ اس زبان کو نظر انداز کیا جائے تو اتر پردیش کچھ بدل جائے گا، اس کی روح بدل جائے گی، اس کا مزاج کچھ سے کچھ ہو جائے گا۔ ہندی کو اتر پردیش میں جو حیثیت دی گئی وہ ٹھیک دی گئی ہے اور ہندی کی ترقی کے لیے اس ریاست میں جو کوششیں ہو رہی ہیں وہ بھی ٹھیک ہیں۔ لیکن اس کے یہ معنی کہاں سے ہوئے کہ اتر پردیش کی سرکار اردو کی ترقی نہ ہونے دے۔ آج بہار میں اتر پردیش سے زیادہ تعداد میں اردو کے ذریعہ سے ابتدائی تعلیم کے لیے اسکول ہیں حالانکہ بہار کی آبادی اتر پردیش سے کم ہے۔ آج ثانوی منزل پر ایک بھی اسکول ایسا نہیں جہاں اردو ذریعہ تعلیم ہو اور اختیاری زبان کی حیثیت سے بھی اردو بہت کم اسکولوں میں پڑھائی جاتی ہے۔ سہ لسانی فارمولے میں اردو کو تیسری زبان کی حیثیت سے پڑھانے کا انتظام بہت چیخ پکار کے بعد کچھ اسکولوں میں ہوا ہے مگر ضرورت کو دیکھتے ہوئے اور طلبا اور ان کے والدین کی خواہشات کا لحاظ کرتے ہوئے بہت ہی کم ہے، بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ پچھلے بجٹ کے اجلاس کے موقع پر وزیر تعلیم نے اعلان کیا تھا کہ پانچ بچے بھی تیسری زبان کے طور پر اردو پڑھنا چاہیں گے تو ان کے لیے ضرور انتظام کیا جائے گا۔ ڈائرکٹر نے اس اعلان کی روشنی میں ایک گشتی چٹھی بھی بھیجی۔ مگر کچھ عرصے کے بعد ایک اور گشتی کے ذریعہ سے اس اعلان کی اہمیت اور افادیت کو محدود کر دیا۔ یعنی یہ ضروری نہیں کہ ہر جگہ کسی اسکول میں اردو کا انتظام کیا جائے بلکہ کسی جگہ اردو کا، کسی جگہ بنگالی کا، کسی جگہ مرہٹی کا، کسی جگہ تامل کا۔ یہ بات نہ صرف سہ لسانی فارمولے کی اسپرٹ کے خلاف ہے بلکہ وزیر تعلیم کے اعلان کے اثر کو اتنا محدود کر دیتی ہے کہ وہ بیکار ہو جاتا ہے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ اتر پردیش کی سرکار کو اردو کی تعلیم کا انتظام کرنے میں اس قدر پس و پیش کیوں ہوتا ہے اور وہ اگر کوئی سہولت فراہم بھی کرتی ہے تو اس کے اثر کو اتنا محدود کیوں کر دیتی ہے۔ ہندوستانی اکیڈمی کو اتر پردیش کی ریاست ایک گراں قدر سالانہ گرانٹ دیتی ہے مگر اکیڈمی اردو کے لیے کچھ نہیں کرتی صرف ہندی پر روپیہ صرف کرتی ہے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے۔ ہمارا ملک بہت بڑا ہے۔ اتر پردیش کی ریاست بھی بہت بڑی ہے اس کے چلانے والوں میں بھی کشادہ دل، وسیع نظر اور اعلیٰ ظرف ہونا چاہیے۔ اتر پردیش کی پس ماندگی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یہاں کے باشندوں کی ایک قابل لحاظ تعداد احساس شکست کا شکار ہے۔ یہ ہے اردو بولنے والی اقلیت۔

اس شمارے میں

اس کے جذبات کا پاس کیا جائے، جمہوری روایات کا احترام کیا جائے، مرکز کی ہدایت پر پورا عمل کیا جائے تو ریاست کی تہذیبی زندگی کو چار چاند لگ سکتے ہیں اور اس میں اردو بولنے والی اقلیت کا بھرپور تعاون مل سکتا ہے۔ دل بڑا ہو اور نظر وسیع ہو تو بڑے بڑے کام چٹکیوں میں انجام پا سکتے ہیں۔ دل تنگ ہو اور نظر محدود ہو تو چھوٹی سے چھوٹی رعایت دیتے ہیں خطرہ نظر آتا ہے۔ دیکھنا ہے کہ ہماری ریاست کب اس محدود تصور سے نکلے گی۔

ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کا انتقال

اخبار پریس میں جا رہا تھا کہ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے انتقال کی خبر ملی۔ اس شاعر اعظم، اہم ڈراما نویس اور چوٹی کے نقاد نے ۷۶ سال کی عمر میں ۴ جنوری ۱۹۶۵ء کو داعی اجل کو لبیک کہا۔ دو سال سے ایلیٹ کی صحت خراب تھی۔

بیسویں صدی کی دوسری چوتھائی کے شروع سے انگریزی ادب پر سب سے گہرا اثر ایلیٹ کا رہا ہے۔ ایلیٹ کی شاعری نے جدید انگریزی شاعری کو ایک نئی سمت سے آشنا کیا۔ اس کی نظم 'THE WASTELAND' شروع شروع میں مشکل سمجھی جاتی تھی مگر آج کی انگریزی شاعری میں ایلیٹ کی زبان، اس کے لہجے اور اس کی بلاغت کا گہرا عکس مل جائے گا۔ (FOUR QUARTETS) اس کا دوسرا بڑا شعری کارنامہ ہے۔

ایلیٹ کا سب سے گہرا اثر تنقید پر ہوا ہے۔ اس نے نہ صرف مغربی تنقید کو متاثر کیا ہے بلکہ ہندوستانی ادبیات کو بھی۔ اردو میں ایلیٹ کے کچھ مضامین کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ اس کی نظم THE WASTELAND کا ترجمہ عرصہ ہوا عزیز احمد نے کیا تھا اور یہ رسالہ اردو میں چھپا تھا۔

ایلیٹ نے تنقید کے منصب کو واضح کیا۔ اس نے تنقید کو روایت کی اہمیت سے آشنا کیا۔ اس نے بعض شاعروں اور ادیبوں کے متعلق نئے بصیرت افروز اشارے کیے۔ اس نے تنقید میں کوئی کتاب نہیں لکھی مگر اس کے مختصر مضامین بڑی بڑی کتابوں پر بھاری ہیں۔

منظوم ڈرامائی صنف کو بھی اس نے ترقی دی۔ اس کے ڈراموں میں MURDER IN THE CATHEDRAL کلیسا میں قتل کا ترجمہ حمید نے اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ ایلیٹ ڈرامائی شاعری کو شاعری کی سب سے اعلیٰ قسم سمجھتا تھا۔ ۱۹۴۸ء میں اسے ادب کا نوبل انعام بھی ملا تھا۔ وہ گہرا مذہبی عقیدہ رکھتا تھا اور اس لحاظ سے اقبال سے خاصی مشابہت نظر آتی ہے۔ ایلیٹ کا نام صرف انگلستان اور امریکہ ہی میں نہیں بلکہ جہاں جہاں انگریزی ادب کی قدر ہے وہاں لیا جائے گا۔ وہ صحیح معنی میں عالمی اہمیت کا ادیب تھا اور انگریزی شاعری اور تنقید میں اس کا مقام بہت بلند ہے۔

ہم پہلی فرصت میں ایلیٹ پر ایک مضمون ہماری زبان میں شائع کریں گے۔

سیر بین

اخبار بلٹز میں آزاد قلم نے "نیا سال نئے ارادے" کے عنوان سے کچھ ممتاز ہستیوں کے "نیک" ارادوں کی تصویر کھینچی ہے۔ آزاد قلم ممتاز ہستیوں کے ارادے بھانپ لینے میں کمال رکھتے ہیں۔ سیر بین والا نہ خود ممتاز ہستی ہے نہ کچھ ایسے نیک ارادے رکھتا ہے، مگر آزاد قلم کی تقلید میں یا جلاپے کی ضد میں کچھ اپنے ارادوں کا بھی ذکر کرنا چاہتا ہے۔

امسال ہمارا ارادہ ہے کہ سیر بین کا کالم صرف شاعروں کی روداد کے لیے وقف کر دیں۔ ہماری زبان کا ایک خاص نمبر حسرت مرحوم اور آنجہانی کی بحث کے لیے نکالیں۔ ہر مہینے کا ایک پرچہ ان غزلوں کی اشاعت کے لیے مخصوص کر دیں جو ہمارے پاس آتی ہیں۔ اخبار کے آٹھ صفحے صرف تحقیقی مضامین کے لیے رکھیں۔ مراسلات کے کالم میں صرف وہ خط شائع کریں جو ایڈیٹر کی تعریف میں ہوں۔ ناظرین و تمکین سے التماس ہے کہ وہ دعا کریں کہ ہمیں ان ارادوں کو عملی جامہ پہنانے کی توفیق ہو۔

میتھلی شرن گپت، جن کا حال میں انتقال ہوا، ہندی کے بہت مشہور شاعر تھے۔ انھوں نے جدید ہندی شاعری پر گہرا اثر چھوڑا ہے۔ ان کے متعلق کسی اخبار میں دیکھا کہ وہ راج سبھا میں بھی منظوم تقریریں کیا کرتے تھے۔ اس پر ہمیں مولانا اقبال احمد سہیل یاد آ گئے۔ مولانا سہیل جب یو۔ پی اسمبلی کے ممبر تھے تو اکثر منظوم تقریریں کیا کرتے تھے۔ افسوس کہ نثر کے اس دور میں ایسی مثالیں خال خال ہی ملتی ہیں۔ ویسے پارلیمنٹ میں شاعرے ہوتے رہتے ہیں۔ کوئی ممبر کبھی شعر سناتا ہے تو کوئی ... سے کم کی بات نہیں کرتا۔ کچھ لوگ داد اس طرح دیتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے چھت اڑ جائے گی۔ ہاں شمع کے بجائے صدر کی نگاہ گردش کرتی رہتی ہے۔ کبھی کبھی داد بے داد بھی ہو جاتی ہے۔

کوئی صاحب خدارا بتائیں کہ پیاموں کا ... جائے۔ اب تو شاید ہی کوئی ایسی کانفرنس ہوتی ہو جس میں دس پانچ پیامات پڑھ کر سنائے جاتے ہوں۔ اگرچہ ان میں صرف کانفرنس کے لیے بہترین خواہشات کے اظہار کے علاوہ ... بھی ہوتا ہے۔ ان پیاموں کے پڑھنے سے کس کا بھلا ہوتا ہے؟ بس یہی تو معلوم ہو جاتا ہے کہ منتظمین نے ان لوگوں کو بھی کسی نہ کسی طرح سے بیگار کر لیا ہے۔ اب تو کسی پیام میں کانفرنس کے مقصد اور اہم مسائل پر روشنی ڈالنے کی بھی کوئی تکلیف گوارا نہیں کرتا۔

اکبر علی خاں (رامپور)

غالب کی ایک نامکمل غزل کی تکمیل

چند نو دریافت شعروں سے

اس قدر ضبط کہاں ہے کبھی آ بھی نہ سکوں
ستم اتنا تو نہ کیجے کہ اٹھا بھی نہ سکوں

مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

تم نہ آؤ گے تو مرنے کی ہیں سو تدبیریں
موت کچھ تم تو نہیں ہو کہ بلا بھی نہ سکوں

لگ گئی آگ اگر گھر کو تو اندیشہ کیا
شعلۂ دل تو نہیں ہے کہ بجھا بھی نہ سکوں

ہمنفس کے ہو لیے سب ہے گلہ [illegible]
کیا تصور ہے تمہارا کہ مٹا بھی نہ سکوں

زہر ملتا ہی نہیں مجھ کو ستمگر ورنہ
کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں

ضعف میں طعنۂ اغیار کا شکوہ کیا ہے
بات کچھ سر تو نہیں ہے کہ اٹھا بھی نہ سکوں

ہماری زبان ۱۵ دسمبر ۱۹۶۴ء میں جناب محمود حسین خاں قیصر کا ایک استفسار غالب کی مندرجہ بالا غزل کے اشعار نمبر ۳، ۲ و ۴ کے بارے میں شائع ہوا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ:

ڈاکٹر منشی نرائن شنکا کاری جی نے جو ہندی زبان کے بڑے اچھے ادیب ہیں اور جنھیں اردو کے سیکڑوں اشعار یاد ہیں یہ دو شعر سنا کر فرمایا کہ یہ غالب کے ہیں۔ آج سے ۴۰ سال پہلے یہ اشعار ان کو حضرت جگر مرادآبادی نے لکھنؤ میں اصغر گونڈوی کے یہاں سنائے تھے کیا واقعی یہ اشعار غالب کے ہو سکتے ہیں زبان اور اسلوب بیان تو کچھ ملتا جلتا ہے از راہ کرم ہماری زبان کے پڑھنے والوں کی دلچسپی کے لیے یہ شعر ہماری زبان میں شائع فرما دیں شاید کوئی صاحب روشنی ڈال سکیں۔

اس استفسار کے سلسلے میں جواباً مجھے عرض کرنا ہے کہ اس غزل کا دوسرا، چھٹا اور ساتواں شعر دیوان غالب کی ساری اشاعتوں میں موجود ہے، چوتھا اور پانچواں شعر دیوان غالب کی حد تک پہلی بار نسخۂ عرشی (شائع کردہ انجمن ترقی اردو علی گڑھ) کے حواشی (ص ۳۴۴) میں درج ہوا ہے اور اس کے ساتھ ہی مولانا حامد حسن قادری کے تعریفی مکتوب کا اقتباس بھی ہے۔ اس مکتوب میں مولانا نے ان دو شعروں کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ یہ ہے۔

میرے پاس بزرگوں کے وقت کا دیوان غالب مطبوعہ ۱۸۶۰ء مطبع مفید خلائق آگرہ میں منشی شیو نرائن کے اہتمام سے چھپا تھا، اس میں میرے والد مرحوم کے قلم سے یہ شعر لکھے ہوئے ہیں جو کسی مطبوعہ دیوان میں نہیں ملتے۔

میں نے غالباً ۱۹۲۸ء میں عزیز اللہ خاں رامپوری مرحوم کے رسالہ نیرنگ میں ان اشعار سے متعلق ایک مختصر مضمون چھپوایا تھا۔ اس میں یہ بھی لکھا تھا کہ ان اشعار کے راوی مولوی صادق علی تائب صاحب گڑھ مکتیشر ضلع میرٹھ [illegible] مولوی صاحب، غالب کے زمانے کے بزرگ تھے غالب سے ملے بھی تھے خود اچھے شاعر اور بہت سخن سنج تھے۔ گورنمنٹ سے [illegible] پنشن لے کر ۱۹۰۵ء یا ۱۹۱۰ء میں انتقال کیا۔ میری تحقیق کے مطابق اس بات کا قوی قرینہ ہے کہ مولوی صاحب نے خود غالب سے یا اسی زمانے کے کسی اور شخص سے یہ اشعار نقل کیے ہیں۔ ممکن ہے غالب نے دیوان کی طباعت آخر کے بعد یہ شعر کہے ہوں۔ دونوں شعر بالکل اسی رنگ کے ہیں جیسے پہلے تین شعر (یہاں شعر نمبر ۷،۶،۲) ہیں اور ایسے نہیں ہیں کہ پانچوں شعر ایک ساتھ کہنے کے بعد غالب ان دونوں شعروں کو کاٹ دیتے اور پہلے تین شعر باقی رکھتے۔ البتہ ناقدان غالب فیصلہ کریں اور اس اضافے سے لطف اندوز ہوں۔

ان کے ایک عرصہ بعد میں نے یہی مضمون دوسری طرح لکھ کر رسالہ سب رس حیدرآباد دکن بابت ماہ مارچ ۱۹۴۶ء میں چھپوایا تھا۔ سب رس کا یہ مضمون عبدالماجد دریابادی کی نظر سے گزرا تو انھوں نے مجھے لکھا: ان میں سے ایک شعر کوئی تیس سال قبل سنا ہوا میرے حافظے میں ان الفاظ میں ہے۔

تم نہ آؤ گے تو مرنے کی سو راہیں ہیں
موت کچھ تم تو نہیں ہو کہ بلا بھی نہ سکوں

ایک یہ بھی اچھی طرح یاد ہے کہ اس وقت یہ شعر میں نے غالب کی جانب منسوب سنا تھا۔ سید غالب دہلوی سے تو آپ واقف ہوں گے۔ ان کا

لہ قادری صاحب کے نسخۂ دیوان میں یہ مصرع اس طرح ہے،
"تم نہ آؤ گے تو مرنے کی ہیں سو تدبیریں"

لہ یہ مضمون نیرنگ رامپور کے خاص نمبر جنوری ۱۹۲۸ء میں شائع ہوا تھا

لکھنؤ کے ایڈیٹر حالی کے شاگرد اور اس طرح غالب کے شاگرد در شاگرد۔ آپ کی اطلاع اور تحقیق مزید کے لیے لکھ رہا ہوں۔"

اس کے بعد مجھے مزید تحقیق کا موقع نہیں ملا کہ سید جالب کے کلام میں تلاش کرتا، یا ان کے دوستوں سے پوچھتا۔ اب یہ بھی ممکن ہے کہ دوسرا شعر بھی جالب ہی کا ہو۔ عبدالماجد صاحب نے ایک سنا ایک نہ سنا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک شعر میں غالب و جالب کو توارد ہو گیا۔ اس لیے کہ قافیہ سوچتے وقت جب "بلا بھی نہ سکوں" ذہن میں آئے گا، تو ایسی دو ہی چیزیں ہیں، موت اور دوست اس لیے یہ مصرع تو بنا رکھا ہے:

"موت کچھ تم تو نہیں ہو کہ بلا بھی نہ سکوں"

اب پہلے مصرع میں وہی بات کہنے کی تھی جو دونوں نے کہی لیکن اپنے اپنے الفاظ میں کہی۔ میرے خیال میں غالب کی یہ زبان نہیں ہے

"مر رہنے کی سودا ہی ہی"

مولانا حامد حسن قادری کے اس بیان کے علاوہ ایک اور شہادت بھی ہمارے سامنے ہے۔ اس سے جہاں اس خیال کو تقویت پہنچی ہے کہ زیر بحث اشعار غالب ہی کے ہیں وہاں مطلع اور پانچواں شعر اور دریافت ہوئے ہیں۔

کلیات اقبال کے مرتب جناب عبدالرزاق راشد حیدرآبادی نے اپنے رسالے تحفہ کی جلد ۲ شمارہ ۸، ۹ بابت شعبان رمضان ۱۳۴۴ھ میں ایک نوٹ کے ساتھ یہ مکمل غزل شائع فرمائی تھی۔ انھوں نے اس کے متعلق جو معلومات "کلام غالب غیر مطبوعہ" کے زیر عنوان درج کی تھیں انھیں یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

"مرزا غالب کا یہ کلام جسے ہم ذیل میں تبرکاً درج کرتے ہیں، ہمیں ان کے ایک شاگرد قاضی عنایت حسین مرحوم کی بیاض سے دستیاب ہوا ہے۔ مولانا حسرت موہانی اپنے مرتبہ دیوان میں غالب کے شاگردوں کا ذکر کرتے ہیں لیکن قاضی مرحوم کے نام نہیں لیتے۔ شعرا کے تذکروں میں بھی جو ہماری نظر سے گزرے ہیں ان کے حالات کا پتہ نہیں چلتا۔ ہم اپنی معلومات کی بنیاد پر چند باتیں یہاں بیان کرتے ہیں۔

خاندان بنی حمید کے ایک بزرگ شیخ تقی الدین کے بیٹے قاضی عنایت حسین مرحوم بدایوں کے رہنے والے تھے۔ رنگی تخلص کرتے تھے۔ اچھے خاصے شعر کہتے تھے۔ ملازمت کے تعلق سے ہندوستان کے مختلف شہروں میں قیام کیا۔ کچھ عرصے تک ریاست ٹونک میں ملازم رہے۔ اسی مقام پر مرزا غالب سے تلمذ اختیار کیا جب کہ وہ والی ٹونک کی خواہش پر ان سے ایک دو دفعہ[1] ملنے گئے تھے۔ ۱۸۸۲ء میں حیدرآباد آئے اور ۱۹۰۸ء تک یہیں مقیم رہ کر رود موسی کی مشہور طغیانی کے زمانے میں وطن مالوف چلے گئے مگر وہاں ان کا جی نہ لگا۔ ۱۹۱۲ء میں پھر عازم دکن ہوئے۔ دکن پہنچ کر جام باغ کے محلے میں سکونت اختیار کی۔ ۱۹۱۸ء میں قضا ان کو ہندوستان کھینچ لے گئی وہیں پیوند خاک ہوئے اور ایک لگے دفتوں کی صورت سدھ گئی۔

اس امر کی نسبت کہ ذیل کے شعر غالب کے ہیں ہم نے علامہ سید علی حیدر نظم طباطبائی نواب حیدر جنگ سے (جن کی غالب شناسی بہت مشہور ہے اور جن کے دیوان غالب کی شرح لکھنے کے بعد غالب پر سے مہمل گوئی کا الزام اٹھا) تحقیق چاہی اور دیگر صاحبان ذوق سے بھی استفسار کیا۔ یہ سب اصحاب علامہ طباطبائی کے اس جواب سے اتفاق کرتے ہیں کہ بیاض رنگی میں سے تین[2] شعر جو مرزا غالب کے نام سے لکھے ہوئے ہیں یہ پہلے بھی بلا شبہ غالب کا کلام معلوم ہوتا ہے۔" خود ہماری نظر جہاں تک کام دیتی ہے ہم اس کو غالب ہی کا کلام سمجھتے ہیں۔ اگر کسی صاحب کو اس میں شک و شبہ ہو۔ تو امید ہے کہ وہ معقول وجوہ و دلائل کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار فرمائیں گے۔

رنگی کی بیاض میں یہ غیر مطبوعہ کلام جس طرح لکھا ہوا ہے ہم اس کو بجنسہٖ یہاں نقل کرتے ہیں۔

اس نوٹ کے بعد غزل سے پہلے یہ ایک سطر بھی رسالہ تحفہ میں درج ہے جو بیاض مذکورہ ہی سے نقل ہوئی ہے کہ:

"یہ غزل مرزا صاحب کی پوری دیوان میں طبع نہیں ہوئی ہے۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ بیاض میں اندراج کرنے والے کو اس بات کا علم تھا کہ اس غزل کے اشعار ۲-۳-۴ اور ۶ پہلے سے دیوان غالب میں موجود ہیں اور یہ کہ ابھی تک مکمل شکل

(بقیہ صفحہ ۱۷ پر)

[1] یہ بیان محل نظر ہے کیونکہ غالب کا ٹونک جانا ابھی تک ثابت نہیں ہوا ہے۔

[2] یہ شمار چار ہونا چاہیے تھا سہواً تین لکھا گیا ہے۔

نیا شعر

شہنازؔ زیدی

شعر تو اچھا تھا ظالم کیوں سمجھ میں آ گیا
ہائے میں کہلاؤں گا اب شاعرِ عہدِ عتیق

اٹھ گیا جدت پرستی کا جنازہ دوستو!
پرسا دینے آئیں گے اب شعر سازانِ لقیق

شاعری دراصل ہے عکسِ نگِ تحت شعور
جو شعوری طور پر ہو فن بھی میں غریق

سعی داد ادراک بیکار ہیں جنوں کے بیچ
ذہن مل جاتے ہیں باہم جب بھی پڑھیں

صنعتِ ابہام ہے اک صنعتِ تجدیدیہ
شعر گنجلک ہو تو بن جاتا ہے احساس عمیق

نظم میں کیا ہوں گی ابلاغ و اثر کی قوتیں
کیا سمجھنے کی ضرورت دل اگر خود ہو رقیق

شعر اگر ہو گا معما ہے یہ ساں اور رگِ گل
داد دے مجھ کو بھی کہتے ہیں سب ارباب لئیق

اور نہ؟ حضرت یہ تھیا توسیوں کی بات ہے
جیسے مست اور مدہوش جیسے جگالی اور رشیق

نظم کا ہر ایک مصرعہ یوں ہو یکساں بحر میں
کیجئے ہیں وزن بحر اور ارکان عمیق؟

چند مفروضات ہی تھے یہ عروضی وزن و بحر
عصر حاضر کس لیے اپنائے یہ طور و طریق

چند کوسٹ میں جکڑیں ہر کچھ خیال تشنہ جو
دورِ جدید کے ناقد بھی ہیں بیحد خلیق

بند کچھ ہم بھی نہیں ہیں شعر ہو وزن میں جتا
ہاں سنیں اشعار نو جو لوگ بنتے ہیں ذہین

کاف کچھ کر، نقاط ڈال، واو کی خاد سیں
حسن کی زلف و ادا ہیں جیسے افکار دقیق

لام الف انا فلک کے ہاتھ میں حسرت کا جام
میم عصا یہ تمرکا نون اپنا عمر کی تجھیں

جیم میں رنگ اجنتا کی جوانی کا جمال
گاف شکن بھی استاد نا اہل و شفیق

شعر ہیں شہنازؔ کے جتے ویدی سیمابی
سر نگوں ہے آپ ہی پر ارسطو کی بوطیق

دریوزہ گر

رئیس مینائی

لٹ گیا
درد کا سرمایہ بھری راہوں میں
کٹ گئی
عمر گرانمایہ فقط آہوں میں
اب پریشاں و سراسیمہ لیے پھرتے ہیں
کوچہ کوچہ اسی اک کاسۂ دل کو لے کر
اک ترقی یادہے مقسوم تمنا اپنا
اب اسی بھولی ہوئی، بسری ہوئی بچھڑی ہوئی
یاد کی خیرات لیے
درد کی سوغات لیے
دل غم دیدہ کو ہم پھر سے تسلی دیں گے

---

۱ وشوناتھ سنسکرت کے مشہور عروضی ۲ سنسکرت کا مشہور شاعر، عروضی اور ناقد
۳ جے دیو کی تصنیف ’’کاویہ میمانسا‘‘ ۴ POETICS

روداد جلسہ اساتذۂ اردو دہلی یونیورسٹی

دہلی، ۱۸ دسمبر ۱۹۹۴ء۔ دہلی میں اردو کے اساتذہ کا ایک جلسہ مورخہ سولہ دسمبر کی شام کو فتحپوری ہائر سکنڈری اسکول میں زیر صدارت پروفیسر خواجہ احمد فاروقی صدر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی منعقد ہوا۔ اردو کے اساتذہ نے طے کیا کہ اردو کے اساتذہ کی ایک انجمن باقاعدہ تشکیل کی جائے جس کے مندرجہ ذیل مقاصد ہوں۔

۱۔ پرائمری مڈل ہائر سکنڈری اردو و دیگر اسکولوں کالجوں میں اردو کے تحفظ اور اس کی ترویج و اشاعت کی کوشش کرنا اور اس راہ کی مشکلات کو دور کرنا۔

۲۔ اردو کے اساتذہ کے حقوق کا تحفظ کرنا۔

نیز اس جلسے میں طے پایا کہ جناب قمر شوری صاحب پرنسپل فتحپوری ہائر سکنڈری اسکول اور ڈاکٹر محمد حسن صاحب اس انجمن کے کنوینر مقرر کیے جائیں اور اس کا دفتر فتحپوری ہائر سکنڈری اسکول میں قائم کیا جائے۔ جلسے میں انجمن کا باقاعدہ دستور العمل مرتب کرنے کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی گئی اور مختلف کمیٹیوں کی تشکیل اس غرض سے کی گئی کہ وہ دہلی کے مختلف حلقوں کا دورہ کر کے تمام اسکولوں اور کالجوں میں اردو کی تعلیم کے انتظامات، طلبا کی تعداد اور اساتذہ کے مسائل کے بارے میں مکمل معلومات جمع کریں۔

اردو کے مختلف اساتذہ نے جلسے میں اظہار خیال کیا اور مختلف تعلیمی مسائل کی طرف توجہ دلائی۔ جلسے میں اس بات پر تشویش کا اظہار کیا گیا کہ ابھی تک سہ لسانی فارمولے پر صحیح طریقے پر عمل در آمد نہیں کیا جا رہا ہے۔ جلسے میں یہ بھی طے کیا گیا کہ انجمن طلبا کے والدین، اردو کے ہمدردوں اور دیگر انجمنوں سے رابطہ قائم کرے اور اردو کی تعلیمی سرگرمیوں کی توسیع کرے۔ (محمد حسن زبیری)

امتحانات جامعہ اردو کی منظوری

اردو دنیا کے لیے یہ خبر نہایت مسرت کا باعث ہو گی کہ جامعہ اردو علی گڑھ کے امتحان ادیب کامل اور کسی مستند یونیورسٹی سے بی۔ اے پاس شدہ امیدوار کو دہلی یونیورسٹی نے ۱۴ دسمبر ۱۹۹۴ء کے خصوصی جلسے میں ایم۔ اے (اردو) میں داخل کرنا منظور کر لیا ہے۔ اس طرح وہ امیدوار جو اردو لے کر بی۔ اے نہیں کر سکے ہیں وہ بھی مستفید ہو سکتے ہیں یا تھرڈ ڈویژن پاس شدہ امیدوار ادیب کامل کا امتحان پاس کرنے کے بعد ایم۔ اے (اردو) میں داخلہ لے سکتا ہے اور اپنی تعلیم مکمل کر سکتا ہے۔

(سید مرتضیٰ حسین بلگرامی سکریٹری شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی)

ملک اسمٰعیل حسن خاں

اصغر کی رجائی شاعری

بیسویں صدی کے اردو غزل گو شعرا کی فہرست کافی طویل ہے، لیکن اگر آپ اس میں صاحب طرز اور منفرد غزل گو شعرا کو منتخب کرنا چاہیں تو پھر یہ فہرست بے حد مختصر ہو جائے گی۔ یہاں تک کہ آپ ان صاحب طرز شعرا کو دونوں ہاتھ کی انگلیوں پر شمار کرلیں گے۔ ان شعرا میں اقبال، فانی، اصغر، فراق اور یگانہ کے نام ہمارے سامنے آتے ہیں، جنھوں نے اردو غزل کو نفس مضمون (مواد) کے علاوہ ایک خاص اسلوب بھی دیا ہے۔

اس صحبت میں جدید اردو غزل کے ایک معروف منفرد شاعر کی شاعری کے ایک رُخ کو اہل نظر کے سامنے پیش کرنا ہے جس پر اب تک زمانے کی چشم پوشی کا نقاب پڑا ہوا تھا، لوگ آج اس کے اس خاص وصف پر بہت کم توجہ دیتے اور غور کرتے ہیں اور اس کو محض ایک "صوفی شاعر" کی حیثیت سے جانتے ہیں حالانکہ اس کا تصوف ایک نصب العین رکھتا ہے۔ وہ زندگی سے بیزار یا اس سے فرار پر تیار نہیں بلکہ اس کو ایک مطمح نظر کے تحت نباہنے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ اس کا تصوف بے ثباتیٔ دنیا سے دل تنگ ہو کر گوشہ نشینی، ترک دنیا، اور بے رغبتی و رہبانیت کی تعلیم نہیں دیتا بلکہ دنیائی اذیتوں کو محسوس کر کے حادثات زندگی سے آنکھیں ملانے اور پامردی سے ان کا مقابلہ کرنے کی تلقین کرتا اور دنیا کو ایک نظریے کی روشنی میں نباہنے کا راستہ دکھاتا ہے۔ اس لحاظ سے اس کا تصوف اردو کی قدیم صوفیانہ شاعری سے مختلف ہے اور اس کا یہ انداز نظر اردو کی صوفیانہ شاعری پر ایک اضافہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

اصغر گونڈوی کو اب تک محض ایک قدیم روایتی نظریہ کا حامل صوفی شاعر کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ انھوں نے جس شدت سے حقائق دنیا کو محسوس کیا ہے اور اس کو جس طرح اپنے کلام میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے وہ آپ اپنی نظیر ہے۔ اقبال نے جس طرح تصوف کے قدیم تصور پر ضرب لگائی اور اس کو بالکل الٹ دیا، اسی طرح اصغر نے تصوف میں "فلسفۂ جمالیات" اور زندگی کے رجائی عناصر کو شامل کر کے غزل کی داستان میں وسعت اور تازگی پیدا کی۔ اور مجاز و حقیقت میں ایک ربط یا سمجھوتہ قائم کرنے کی کوشش کی ہے مجنوں[۱] صاحب نے ان کے متعلق یہ بڑی خیال انگیز بات کہی ہے کہ

"مجاز میں حقیقت دیکھنا بہت پرانی رسم ہے، مگر حقیقت میں مجاز کی رنگینیاں قائم رکھنا نئی بات ہے۔ اصغر نے شاعری میں یہی کیا ہے۔ وہ ہماری مادی اور جسمانی زندگی کو بے اصل و بود نہیں بتاتے اور نہ حقائق اور رموز کی دنیا کو ہمارے حدود احساس و ادراک سے باہر کوئی دنیا تسلیم کرتے ہیں۔ وہ نظر، ناظر اور منظور تینوں کی وحدت (Identity) کا پیغام دیتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اس اعتبار سے اگر کہیں ان کا کوئی ہم خیال اور ہم نوا ملتا ہے تو مغربی ممالک میں وہ ہم کو کبھی ہیگل جیسے حکما، اور انگریزی اور دوسری مغربی زبانوں کے مائل بہ تصوف شعرا کی یاد دلاتے ہیں۔ ان کی شاعری نہ مجاز کی شاعری ہے نہ حقیقت کی بلکہ دونوں کو ایک کر کے پیش کرتی ہے۔"

ان کا تصوف دنیا سے ہار کر منہ موڑنے کی تعلیم نہیں دیتا بلکہ مراحل دنیا سے مقابلہ کرنے اور کارزار حیات میں نبرد آزمائی کی تعلیم دیتا ہے۔ "تگاپوئے دمادم" اور "ذوق عمل" ہی سے ان کے نزدیک دنیا کی رونق کا بازار گرم ہے، جد و جہد میں زندگی کا راز مضمر ہے، کشمکش زندگی کے لیے لازمی ہے ورنہ یہ کارخانۂ عالم قائم نہیں رہ سکتا، ہر شخص اپنے مقصد کے حصول کا جویا ہے اور اس کے لیے وہ سعی و عمل سے کام لیتا ہے، تمام دنیا جس مرکز پر گھومتی ہے وہ "عمل و محنت" کا مرکز ہے، قرآن میں ایک جگہ مرقوم ہے کہ "خَلَقَ الْاِنْسَانَ فِیْ کَبَدٍ" (ہم نے انسان کو محنت کے لیے پیدا کیا ہے)، انسان کی زندگی اور دنیا کا نظام محض اسی ایک مرکز کی تفسیر ہے، بقول اصغر ؎

وہ شور تھیں، نظام جہاں جن کے دم سے ہے
جب مختصر کیا انھیں انساں بنا دیا

اصغر جدید اردو غزل میں وہ واحد شاعر ہیں، جن کا کلام از اول تا آخر رجائیت سے معمور ہے۔ انھوں نے اردو شاعری کو زندہ دلی، شگفتگی، رجائیت اور ترانہ بار اور تر و تازہ فضا عطا کی اور اردو شاعری کی فردگی، ناکامی، اداسی کو اپنے رجائی نغموں سے خوشگوار بنا دیا۔ ان کے معاصرین میں یہ کیفیت اس انداز اور

---

[۱] اردو میں اب تک اصغر پر بہت کم لکھا گیا ہے اور جتنے مضامین لکھے گئے ہیں ان میں صرف دو ایک کے علاوہ کوئی ان کے خیالات یا ان کے (بقیہ نوٹ کالم دو میں)

(بقیہ نوٹ کالم نمبر ۱) نقطۂ نظر کی روح یا گہرائی تک نہ پہنچ سکا۔ مجنوں گورکھپوری نے ان پر ایک مختصر سا مضمون لکھا ہے لیکن اس میں انھوں نے ان کی شاعری کی جن خوبیوں کی طرف اشارے کیے ہیں وہ بڑے قابل غور اور خیال انگیز ہیں۔ (اسمٰعیل)

اس زاویۂ فکر سے کسی کے ہاں نظر نہیں آتی ہے۔ قنوطی، مایوسی اور قنوطیت اصغر کے مسلک میں گناہ ہے۔ وہ زندگی کی مشکل اور حادثات دہر سے کسی طرح گھبراتے ہیں نہ ان سے کنارہ کشی پر آمادہ ہو سکتے ہیں ان کا ایک شعر ہے ؎

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

انھوں نے اردو غزل کو جو توانائی، رجائیت اور شگفتگی دی ہے وہ ان کا بہت بڑا contribution ہے۔ ان کے یہاں ایک مستقل و مکمل نظریۂ جمالیات ملتا ہے، لیکن جمالیات کا یہ نظریہ قدیم صوفی شاعروں کے "نظریۂ جمالیات" سے مختلف ہے۔ اصغر کو زندگی بھی اتنی ہی روشن اور پرنور معلوم ہوتی ہے جتنی کہ وہ خدا کی صفات میں روشنی اور نور دیکھتے ہیں۔ زندگی کی صعوبتیں، پریشانیاں، کلفتیں بھی ان کی نظر میں حسین بن جاتی ہیں۔ کروچے (Croce) کے بقول حسن اصل میں دیکھنے والے کے وجدان میں ہوتا ہے نہ کہ حسین شے میں۔ اگر نظر "احساسِ حسن" رکھتی ہے تو پھر وہ ہر گوشہ میں اپنی بصیرت کے لحاظ سے حسن تلاش کر لے گی اور اگر وہ "احساسِ حسن" سے عاری ہے تو تاج محل جیسا پیکرِ حسن بھی اس کو حسین و جمیل نظر نہ آئے گا۔ اصغر نے شاعری کو زندگی کا جو عرفان دیا اور زندگی کو رجائی شاعری کی جو نعمت عطا کی وہ ادبیاتِ اردو میں ان کا خاص کارنامہ ہے۔

انھوں نے اردو غزل کو جو نظم و ضبط، نکھار، صاف ستھرا پن، شائستگی اور سنجیدگی، وقار، متانت، پاکیزگی عطا کی وہ ان کی شخصیت کا خاصہ اور صفت ہے۔ گویا ان کی شخصیت ان کی شاعری پر عکس ریز ہے اور ان کی شاعری ان کی شخصیت کا آئینہ ہے۔

اصغر کو "حسن" اور "حرکت" سے بے انتہا عشق ہے اور یہی جذبہ ان کی شاعری کا سنگِ بنیاد ہے ان کا ایک شعر ہے ؎

ذروں کا رقص مستیِ صہبائے عشق ہے
عالم رواں دواں بہ تقاضائے عشق ہے

ان کی شریعت میں جمود و سکوت گناہ بلکہ کفر کے مترادف ہے اور اسی وجہ سے آہ و زاری اور نالہ و شیون جو "جمود اور بے حرکت" زندگی کا لازمہ یا اقبال کے الفاظ میں "عوقِ انفعالی" ہے۔ ان کے یہاں ناپید ہے۔ اصغر کے یہاں ہر جگہ امید و حوصلہ کے چراغ روشن ہیں۔ وہ خود فرماتے ہیں ؎

خروشِ آرزو ہو نغمۂ خاموشِ الفت ہو — یہ کیا اک شیوۂ فرسودہ آہ و نالہ برسوں
غزل میں زندگی تو نے اصغر بھر دیا ایسا — کہ اس میدان میں سنتے تھے بس فریاد و شیون

غزل کیا اک شرارِ معنوی گردش میں ہے اصغر — یہاں افسوس گنجائش نہیں فریاد و ماتم کی

شعر میں رنگینی و جوشِ تخیل چاہیے — مجھ کو اصغر کم ہے عادت نالہ و فریاد کی

لیکن وہ غزل میں صرف "رنگینی و جوشِ تخیل" ہی کو کافی نہیں سمجھتے بلکہ ؎

اصغر غزل میں چاہیے وہ موجِ زندگی — جو حسن ہے بتوں میں جو مستی شراب میں

اصغر کو اگر "شاعرِ حیات" کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ اردو غزل میں اقبال کے علاوہ اصغر اور صرف اصغر ہی وہ واحد شاعر ہیں جنھوں نے شاعری کو زندگی کا عرفان عطا کیا اور زندگی سے نبٹنے اور اس میں الجھنے اور اس کو برتنے کا شعور و ولولہ دیا۔ مجنوں صاحب کے بقول "وہ زندگی کے دردناک سے دردناک حقائق کی طرف بڑے نرم اور نکھرے ہوئے لہجے میں اشارہ کرتے ہیں اور ہم کو زندگی سے برداشتہ خاطر یا بیزار نہیں ہونے دیتے۔ بلکہ ہمارے اندر ہستی کے آغاز و انجام اور اس کی ناگزیر رفتار کا ذوق پیدا کر کے دلوں میں زندگی کی ایک نئی نشاط انگیز تاب پیدا کرتے ہیں۔ اور اس سے ہم اپنی روح میں ایک بالیدگی محسوس کرنے لگتے ہیں۔"

ان کے یہاں بلند ہمتی، عالی حوصلگی اور کشمکشِ حیات میں زندگی گزارنے کا درس ملتا ہے۔ وہ "ضمیرِ اہلِ مناجات کے تعطل میں خروشِ جذبۂ تکمیلِ کار" پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ زندگی ان کے یہاں اقبال کی طرح ہر وقت "رواں دواں اور جواں" ہے ؎

شمیمِ گلشن، نسیمِ صحرا، شعاعِ خورشید و موجِ دریا
ہر ایک گرمِ سفر ہے ان میں مگر کوئی ہمسفر نہیں ہے

وہ عمل اور سعی و کوشش کے مؤید ہیں اور ہر انقلاب کو حیاتِ نو کا پیغام سمجھتے ہیں ؎

وہ موت ہے کہ کہتے ہیں جس کو سکون سب — وہ عین زندگی ہے جو ہے اضطراب میں
کیوں شکوہ سنجِ گردشِ لیل و نہار ہوں — اک تازہ زندگی ہے ہر اک انقلاب میں
میخانۂ ازل میں جہانِ خراب ہیں — ٹھہرا لیا ہے ایک جگہ اضطراب میں

وہ مجبوریِ حیات سے مایوس نہیں بلکہ زنداں میں بھی روزن بنا سکتے ہیں اور قفس میں "موجِ خونِ دل" سے گلستاں تعمیر کر سکتے ہیں۔

مجبوریِ حیات میں رازِ حیات ہے — زنداں کو میں نے روزنِ زنداں بنا دیا

بنا لیتا ہے موجِ خونِ دل سے اک چمن اپنا — وہ پابندِ قفس جو فطرتاً آزاد ہوتا ہے

اقبال نے غالب کے اس شعر ؎

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں — گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

کے جواب میں کہا تھا کہ ؎

خطر پسند طبیعت کو سازگار نہیں — وہ گلستاں کہ جہاں گھات میں نہ ہو صیاد

اصغر بھی ان کے دوش بدوش یہ فرماتے ہیں ؎

مار ڈالے گی مجھے عافیتِ کنجِ چمن — جوشِ پرواز کہاں جب کوئی صیاد نہ ہو

زندگی کا مقصد اور ذوقِ مقصد کے حصول کی لگن دور پر قائم ہو
اگر آرزو و حسرت نکل جائے تو پھر دنیا کے تمام مسئلے اور مسائل سرد پڑ جائیں

فراق میں جو لذت ہے وہ وصال میں کہاں؟ اقبال نے اپنی نظم "ذوق و شوق" میں کہا ہے ؎

گرمیِ آرزو فراق، شورشِ ہائے و ہو فراق
موج کی جستجو فراق! قطرہ کی آبرو فراق

اصغر بھی اس نکتے سے خوب واقف ہیں اسی لیے وہ فرماتے ہیں ؎

جستجو ہے زندگی ذوقِ طلب ہے زندگی
زندگی کا راز لیکن دوریِ منزل میں ہے

دوسری جگہ کہتے ہیں ؎

سارا حصولِ عشق کی ناکامیوں میں ہے
جو عمر رائیگاں ہے وہی رائیگاں نہیں

انسان ان کی نظر میں خود اپنی قسمت کا خالق ہے اگر "ذوقِ عمل" میں ذرا کمی ہو تو پھر آلام و مصائب میں گرفتار ہونے میں دیر نہیں لگتی، زندگی "ذوقِ عمل" سے عبارت ہے ؎

یہاں کوتاہیِ ذوقِ عمل ہے خود گرفتاری
جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے

غم سرشتِ کائنات کا جزو ہے جس سے کسی کو نجات یا مفر نہیں، غم، غم ہی کا نتیجہ نہیں، غم خوشی کا بھی نتیجہ ہے۔ ہر تبسم آنسو کے افق سے طلوع ہوتا ہے۔ غم فریاد کی ایسے ہے Keats کہتا ہے۔

"Where but to think is to be full of sorrow"

لیکن کشمکشِ حیات میں انسان کو اس سے گزرنا ہی پڑتا ہے اور وہ ایسا اضطراب پیدا کرتا ہے جس میں اسے سکون ملے، ورنہ اگر غم ہی غم ہو تو زندگی اجیرن ہو جائے کاشِ حیات کے غم کی نوعیت دوسری ہے جو زندگی کی لے کو تیز کرتا اور اس کے لیے مہمیز کا کام دیتا ہے۔ شیلی (Shelley) نے ایک جگہ لکھا ہے:

"Our sweetest songs are those that tell of saddest thought"

اصغر کا نظریہ بھی اس بارے میں یہی ہے۔ وہ فرماتے ہیں ؎

اضطرابِ غم سے ہے نشو و نمائے زندگی
ہر نفس میں ایک تازہ درد پیدا کیجیے

لیکن اس کے باوصف وہ کہیں سے قنوطی نہیں ہیں۔ جذبۂ قنوطیت کی طرف لے جاتا ہے ذہن رجائیت کی طرف، یہ درد کی لذت ہی زندگی کی لے کو تیز کر دیتی ہے اور وہ آلامِ روزگار کو "غمِ جاناں" سمجھ کر برداشت کر لیتے ہیں ؎

آلامِ روزگار کو آساں بنا دیا
جو غم ہوا اسے غمِ جاناں بنا دیا

لیکن بڑے زہر پینے اور ہضم کرنے کے بعد یہ آبِ حیات ملتا ہے۔ اصغر کہتے ہیں ؎

اس جہانِ غیر میں آرام کب راحت کہاں
لطف جب ہے اپنی دنیا آپ پیدا کیجیے

آغوش میں ساحل کے کیا لطفِ سکوں اس کو
یہ جانِ ازل ہی سے پروردۂ طوفاں ہے

یہاں تو عمر گذری ہے اسی موجِ تلاطم میں
وہ کوئی اور ہوں گے سیرِ ساحل دیکھنے والے

غرضکہ وہ کسی جگہ زندگی سے شکست خوردہ یا مایوس نظر نہیں آتے وہ میدانِ حیات میں اترنے اور اس سے نباہنے کا راستہ بتاتے ہیں۔ وہ سکوت و جمود کے مخالف اور عمل و حرکت کے مؤید ہیں کیوں کہ ان کی نظر میں انسان کی بہتری کا راز "مثبت عملی طاقتوں" میں پنہاں ہے، دنیا جس صناع کی صنعت کا شاہکار ہے وہ عمل و حرکت ہی کی بنیاد پر قائم ہوئی ہے۔ اس کا جمال انسان کو "مادیت و روحانیت" دونوں میں حسن و بہجت پراگندہ اور اپنے قریب بلاتا ہے۔ بس یہی خیال اصغر کو ایک نصب العین دے کر "پیامِ آسودگی" بن جاتا ہے۔ ان کے ذکر کے نغموں میں بھی یہی "رجائی لے" بکھری ہوئی ہے ؎

شعاعِ مہر خود بے تاب ہے جذبِ محبت سے
حقیقت ورنہ سب معلوم ہے پروازِ شبنم کی

ایک شعلہ اور شمع سے بڑھ کر ہے رقص میں
تم جیتے جی تو سینۂ پروانہ دیکھیے

برگِ گل کے دامن پر رنگ بن کے جا کیا
اس فضائے گلشن میں موجِ صبا ہو جا
آدمی نہیں سنتا آدمی کی باتوں کو
پیکرِ عمل بن کر غیب کی صدا ہو جا

یہ دین ہے وہ دنیا یہ کعبہ وہ بت خانہ
اک اور قدم بڑھ کر اے ہمتِ مردانہ

مرنا تو ہے ابتدا کی اک بات
جینا ہے کمالِ منتہی کا

میں یہ کہتا ہوں فنا کو بھی عطا کر زندگی
تو کہاں زندگی کہتا ہے مر جانے میں ہو

تڑپنا ہے نہ جلنا ہے نہ جل کر خاک ہو جانا
یہ کیوں سوئی ہوئی ہے فطرت پروانہ برسوں سے

ہیجان و اضطراب ہے، امید وصل پر
راز حیات شورشِ بیجائے عشق ہے

چند شوں سے اور بھی ذوق رہائی بڑھ گیا
اب قفس بھی ہم اسیر دل کو پر پرواز ہے

میری قربانی کے اندر سے یہ دکھا اس نے ہمدرا
قریب منزل راہ ہو اب میری راہ اک ذرا بھی ہو

شبلی اکیڈمی کے لیے حکومت کشمیر کا دس ہزار روپیہ کا عطیہ!

جموں، ۲۳ر دسمبر۔ حکومت کشمیر نے اعظم گڑھ (اتر پردیش) کی شبلی اکیڈمی کے لیے دس ہزار روپیہ کی منظوری دی ہے۔ اس میں سے پانچ ہزار روپیہ کی رقم جاریہ سال کے لیے اکیڈمی کو گرانٹ کے طور پر دی گئی ہے اور باقی پانچ ہزار روپیہ اکیڈمی کی گولڈن جبلی تقریب کے لیے عطیہ ہے (سیاست جدید کانپور)

بلقیس جمال کے لیے وظیفہ کی منظوری

لکھنؤ ۲۳ر دسمبر۔ اتر پردیش کے گورنر نے ادب اور فنون وغیرہ میں نمایاں مقام حاصل کرنے والے لوگوں کی سرکاری امداد کی اسکیم کے تحت شریمتی بلقیس جمال بریلوی ساکن شفیع آباد چمن گنج کانپور کے لیے یکم دسمبر ۵۴ء کی تاریخ سے ایک سال تک ساٹھ روپیہ ماہوار وظیفہ کی منظوری دی ہے۔

(سیاست جدید کانپور)

اعلیٰ عدالتوں میں ہندی رائج کرنے سے انصاف میں رکاوٹ پڑے گی (این سی چٹرجی)

کلکتہ ۲۲ر دسمبر۔ مشہور قانون داں اور ممبر پارلیمنٹ مسٹر این سی چٹرجی نے کہا ہے کہ ہائی کورٹوں اور سپریم کورٹ میں ہندی رائج کرنے سے انصاف کے شعبہ میں رکاوٹ پڑے گی۔ انھوں نے کل یہاں صوبائی وکلا کی کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ قانون ہم آہنگی پیدا کرنے والا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ اس شعبہ میں ہندی لانے سے اس ہم آہنگی پر اثر پڑے گا (سیاست جدید کانپور)

گورکھپور میں بزم فارسی کا قیام

گورکھپور ۲۴ر دسمبر۔ فارسی زبان و ادب کے پرستاروں کا ایک جلسہ فرینڈس ہوٹل میں منعقد ہوا جس میں "بزم فارسی" کے نام سے ایک انجمن کا قیام عمل میں آیا۔

حسب ذیل حضرات اس کے عہدہ دار منتخب ہوئے
حکیم مقبول احمد انصاری صدر (ایڈیٹر صبح وطن)، ایم۔ کوٹھیادی راہی نائب صدر۔ احمر لاری ناظم اعلیٰ۔ اطہر عباس دانش ناظم نشر و اشاعت۔ عرفی آفاقی ناظم۔ جوہر وارثی خازن۔ شمسی رودولوی محاسب

(احمر لاری)

فروری میں ہند اور پاکستان کے مصنفین کی کانفرنس لاہور میں ہوگی

نئی دہلی ۲۴ر دسمبر۔ مغربی پاکستان کی پنجاب لٹریری لیگ لاہور آئندہ سال فروری میں ہند اور پاکستان کے مصنفین کی ایک مشترک کانفرنس لاہور میں کرنے کا ارادہ کر رہی ہے لیگ کا ایک وفد یہاں آیا ہے۔ اور مختلف ثقافتی تنظیموں کے نمائندوں اور ادیبوں سے بات چیت کر رہا ہے ہندوستان سے ایک وفد بھیجنے کا انتظام کرنے کے لیے ایک کمیٹی بنادی گئی ہے جس کے صدر گیانی گرمکھ سنگھ مسافر ہیں۔

(سیاست جدید کانپور)

(صفحہ ۳ سے آگے)

میں کہیں شایع نہیں ہوئی ہے۔

یہاں یہ ایک بات اور قابل ذکر ہے کہ بیاض خود رشکی میں ردیف "بھجوا سکوں" کے بجائے "بھی نہ سکوں" ہے جو یقیناً سہو کتابت ہے۔

ان سارے بیانات کے پیش نظر یہ ماننے میں تامل نہیں ہونا چاہیے کہ اس غزل کا پہلا (مطلع) تیسرا، چوتھا اور پانچواں شعر بھی غالب کا ہی ہے اور ان کا انتساب جالب یا کسی دوسرے شخص کی طرف کرنا ان شہادتوں کے بعد بے معنی سا ہو جاتا ہے۔

یہاں یہ ساری غزل مع ان اشعار کے جو نسخہ دیوان غالب یا حواشی نسخہ عرشی میں آچکے ہیں شریک کی جاتی ہے تاکہ لطف اندوزی میں کمی نہ آئے اور قارئین کے ذوق کو بھی اپنے جانچنے میں دقت نہ ہو کہ یہ اشعار تقریب تقریب ایک معیار کے ہیں اور ان کا انداز بیان غمازی کرتا ہے کہ ان سب کا مصنف ایک ہی ہے۔

رہا یہ سوال کہ غالب نے ۷ شعروں کی ایک نظم میں سے صرف ۳ شعر کیوں انتخاب کیے سو عرض ہے کہ مطلع کی زبان اور طرز ادا چست نہیں معلوم ہوتی۔ اسی طرح چوتھا اور پانچواں شعر بھی صاف ستھرے نہیں کہے جا سکتے۔ تیسرے شعر میں محبوب کا موت سے تقابل کیا گیا ہے جو واقعی سقیم بات ہے اور آداب محبت کے خلاف اس لیے ان اشعار کا حذف کر دینا غالب کی خوش ذوقی کا تقاضا تھا اور اس کے حسن انتخاب کی ایک اچھی مثال۔

مختار الرحمٰن راہی کا تبادلہ

کوٹہ۔ نامور ادیب و شاعر مختار الرحمٰن راہی کا تبادلہ جے پور ہو جانے کے سلسلے میں بزم شعور کوٹہ کے زیر اہتمام ایک ادبی نشست ہوئی۔

چاند مظفر نگری، مختار الرحمٰن راہی، شاد کوٹوی، خورشید شمسی، خلیل اکبر آبادی، رام جس وجے، شمشاد اکبر آبادی اور وِدیا ساگر نے اپنی تخلیقات سے سامعین کو محظوظ کیا۔ اس محفل کی صدارت محمد احمد نے کی۔

یہ محفل شب کے ۱۲ بجے ختم ہوئی۔

مختار الرحمٰن راہی مقامی ادبی سرگرمیوں کے روح رواں تھے۔ اور ان کے اس اچانک تبادلے پر ادارہ بزم شعور اور دیگر احباب کو بے حد ملال ہے۔

(وِدیا ساگر سکریٹری)

دیوان حافظ کا بنگالی میں ترجمہ کرنے والی خاتون کا انتقال

کانپور ۲۸ دسمبر ممبر پارلیمنٹ مسٹر ایس۔ ایم۔ بنرجی کی والدہ مسز پورنا ششی دیوی کا آج صبح انتقال ہو گیا۔

ششی دیوی نے ۸۰ برس کی عمر پائی ششی دیوی بنگالی زبان کی ممتاز ادیبہ تھیں۔

ششی دیوی نے دیوان حافظ کا فارسی سے بنگالی میں ترجمہ کیا تھا۔

(مدینہ بجنور)

جارجیائی زبان میں "الف لیلیٰ"

جارجیا کے عربی دانوں نے مشہور داستان "الف لیلیٰ" کا جارجیائی زبان میں ترجمہ مکمل کر لیا اب اس کی اشاعت کی تیاریاں ہو رہی ہیں یہ ترجمہ قاہرہ میں طبع شدہ نسخے سے کیا گیا ہے، جس میں کئی ماہرین نے چیف ایڈیٹر جارجی تسیریلی کی سربراہی میں اس بڑے کام کو انجام دیا۔ اس سے پہلے "الف لیلیٰ" کی صرف ایک کہانی جارجیائی زبان میں پیش کی گئی تھی۔

ہماری زبان

سے خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں

مراسلات

مرحوم اور آنجہانی

بہت دن سے "ہماری زبان" کے کالموں میں "مرحوم اور آنجہانی" پر ایک ایسی بحث چل رہی ہے جس کا زبان یا ادب سے کوئی تعلق نہیں۔ اس بحث تک اس موضوع پر جو کچھ لکھا جا چکا ہے اس میں قطعاً کچھ حاصل نہیں ہوا۔ ہاں یہ اندیشہ ضرور پیدا ہو گیا ہے کہ اگر یہ بحث اسی طرح جاری رہی اور میں لسطو میں لیٹ لپھر کی فضا اسی طرح موجود رہی تو کچھ مدت میں یہ بحث خالص فرقہ وارانہ اور سنگین انداز کی سیاسی صورت اختیار کرے گی۔ خدا کی رحمت غیر مسلموں پر نازل ہوتی ہے یا نہیں ہوتی اس موضوع پر بحث کرنے کا زمانہ گزر گیا جو جس کا عقیدہ ہے وہ اسے مبارک ہو۔ اسے ادبی جرائد میں بحث کا موضوع بنانا کسی طرح مستحسن نہیں۔ ہندوستان میں ایک دور ایسا گزرا ہے جب اس قسم کے مباحثوں اور مناظروں نے ملک گیر اہمیت حاصل کر لی تھی لیکن جہاں تک مجھے یاد ہے ہمارے ادبی جرائد نے اپنے صفحات کو اس وقت بھی اس بحث سے دور رکھا تھا اور اب تو اس بات کی ضرورت اور زیادہ ہے کہ ادب کا دامن ان مباحثوں سے پاک رکھا جائے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذہبی اور دعاریک جرائد آج بھی ہندوستان میں موجود ہیں اس قسم کے مسائل کو حل کرنے کی ذمہ داری ان پر ہے ادبی جرائد پر نہیں۔

ہم ہندوؤں کو اس بات پر اگر اعتراض ہو کہ ہمارے گزرے ہوئے بزرگوں کو آنجہانی لکھا جائے تو ہمیں چاہیے کہ ہم "آنجہانی" کی جگہ کوئی اور لفظ تجویز کریں اس کی مناسب تشہیر و اشاعت کریں۔ ہمارے بے مسلمانوں کا اس بات پر مجبور کرنا کہ وہ ہمارے گزرے بزرگوں کو بھی مرحوم لکھیں کسی طرح زیب نہیں دیتا۔ مسلمانوں کے لیے یہ ایک مذہبی عقیدہ ہے "جہاں کی اور دوزخ کے" ہے آج کے دور میں بحث کا موضوع بنانا آنجہانی خود ... ہندی، بھائی کا لفظ اگر ہمیں پسند نہ ہو تو ہم اس کی جگہ پر کوئی موزوں لفظ تجویز نہیں کر سکتے تو ہمیں اپنے دینی الفاظ کا ماتم کرنا چاہیے کہ سنسکرت نے کیا لفظ ہے۔ میں ہندی یا سنسکرت نہیں جانتا اس لیے یقین تو نہیں کہہ سکتا لیکن میرا خیال ہے "سورگیہ" یا "سورگ باشی" کا لفظ ہم گزرے ہوئے لوگوں کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ غالباً ہندوستان اور ہندوستان سے باہر کے ہندوؤں میں یہی لفظ مستعمل ہے۔ اگر "آنجہانی" ہمیں پسند خاطر نہیں تو ہم "سورگیہ" یا "سورگ باشی" یا ایسا ہی کوئی اور لفظ اپنا کر اس بحث کو کم از کم اپنی طرف ختم کر سکتے ہیں۔

(جگن ناتھ آزاد)

۲

میں اس موضوع پر خاموش رہنا چاہتا تھا لیکن ہماری زبان کے صفحات پر بار بار آنجہانی کا استعمال دیکھ کر قلم اٹھانے پر مجبور ہو گیا ہوں۔ ۲۲ نومبر ۱۹۹۴ء کے ہماری زبان میں لکھنؤ کے کسی صاحب کی منظوم تصنیف "شہر دعا" کی آنجہانی نہرو جی کی یاد میں) کا تعارف ہے۔ ۲۲ دسمبر ۱۹۹۴ء کے ہماری زبان میں "ادیب کی ذمہ داری" کے عنوان سے ایک صاحب کا مضمون ہے جس میں کیسے حسین جذبات کا اظہار کیا گیا ہے:

"ادیب کا فرض ہے کہ وہ مختلف فرقوں اور مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان محبت و یگانگت کے جذبات پیدا کرنے کی امکانی سعی کرے۔ ایسا ادب تخلیق کرے جو انسانوں کے دلوں سے تعصب اور فرقہ پرستی کی بیخ کنی کرے"

لیکن اسی مضمون کے صفحہ ۵ پر "مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم، مولانا حسرت موہانی مرحوم، آنجہانی مہاتما گاندھی، سروجنی نائیڈو آنجہانی، ڈاکٹر راجندر پرشاد اور ہمارے محبوب و محترم وزیر اعظم آنجہانی پنڈت جواہر لال نہرو" کی منتخب فہرست پیش کر کے مختلف مذاہب کے درمیان یگانگت کا کوئی حوصلہ افزا نمونہ پیش نہیں کیا گیا۔ کتنے غیر محتاط ہیں ہماری زبان کے مدیر کہ وہ اسی شمارے کے اداریے میں "مرحوم پنڈت جواہر لال نہرو" لکھ کر خواہ مخواہ معتوب ہو گئے۔

یکم اکتوبر ۱۹۹۴ء کے ہماری زبان میں اس موضوع پر ڈاکٹر جعفر حسین کا جو مراسلہ شائع ہوا ہے اس میں چند باتیں ایسی ہیں جو غلط فہمی پیدا کر سکتی ہیں۔ لکھتے ہیں:

"جب غیر مذہب سے گزرے ہوئے افراد کا حوالہ دینا ہوتا ہے تو مسلمان آنجہانی اور ہندو پرلوک باشی کہتے ہیں۔ ..... اس کا مطلب یہی نکلتا ہے کہ ایک مسلمان کے نزدیک کوئی بھی غیر مسلم جنت میں نہیں جا سکتا اور ایک ہندو کے نزدیک کوئی بھی غیر ہندو سورگ میں نہیں جا سکتا"

مسلمانوں کے عقیدے کے بارے میں کچھ کہنے کا مجاز نہیں ہاں ہندوؤں کے عقیدے پر ضرور ... ہندو کبھی داخل سکتا ہوں۔ پرلوک کا لفظ اردو میں تو دیکھنے میں نہیں آیا ہندو اگر ... کا استعمال کرتے ہوں گے تو ہندی ہی میں کرتے ہوں گے۔ جب مجھے ہماری زبان کا مذکورہ شمارہ ملا میں اردو کانفرنس کے سلسلے میں بہار میں تھا میں نے پنڈت ... سے پوچھا۔ کیا آپ نے کبھی ہندی میں غیر ہندو مرحومین کے لیے پرلوک باشی کا استعمال دیکھا ہے۔ انھوں نے نفی میں جواب دیا میں نے خود یہ لفظ کبھی نہیں سنا۔ ہاں مسلمان مرحومین کے لیے ہندی میں سورگیہ کا استعمال ایک ... نہیں بارہا دیکھا اور سنا ہے۔ پھر بھی میں نے جواہر لال اپنے ساتھی ہندی کے پروفیسر سے پوچھا کیا ہندی میں غیر ہندو مرحومین کے لیے سورگیہ کی جگہ پرلوک باشی لکھا جاتا ہے۔ انھوں نے جواب دیا نہیں سورگیہ ہی لکھتے ہیں۔ پرلوک باشی تو اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ آپ یہ کیوں پوچھ رہے ہیں۔ اس کی ضرورت کیسے آ پڑی۔ ... ایسا محسوس ہوا کہ انھیں یہ بتانے کی بھی ضرورت نہ تھی کہ ہماری اردو میں مرنے کے بعد بھی ہندوؤں اور مسلمانوں میں فرق کیا جاتا ہے میں نے انھیں یہ کہہ کر ٹال دیا کہ کچھ نہیں یوں ہی پوچھ بیٹھا تھا۔ افسوس ہے کہ اگر ڈاکٹر جعفر حسن نے کہیں ہندی میں پرلوک باشی کا استعمال دیکھا ہے تو اس کی حیثیت استثنائی ہے عام رواج نہیں۔

سب سے نزدیک دوسرا بیان کہ ہندوؤں کے نزدیک کوئی بھی غیر ہندو سورگ میں نہیں جا سکتا" بھی بے بنیاد ہے۔ یہ مذہبی بحث ہے اس پر گفتگو بے سود تھا لیکن چونکہ ہماری زبان کے صفحات میں یہ بیان جگہ پا چکا ہے اس لیے اس کی بے ضرر تردید میں کوئی ہرج نہیں۔ ہندوؤں میں عقیدے کی اہمیت نہیں اعمال کی ہے ظاہر ہو کہ ہندو دھرم اسلام یا عیسائیت کی طرح نہیں۔ ہندو دھرم کا مقابلہ جین اور بدھ دھرم سے ہوا لیکن جینیوں کے سب سے پہلے تیرتھنکر رشبھ دیو تھے اور بدھ مذہب کے بانی گوتم بدھ تھے۔ ہندوؤں نے ان کو اوتار تسلیم کر لیا۔ جو مذہب مخالف مذاہب کے بانیوں کو بھگوان کا اوتار مان لے اس کے بارے میں کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ اس کے نزدیک غیر ہندو سورگ میں نہیں جا سکتا۔ جین دھرم کے مطابق درجہ بدرجہ بلندی کے اعتبار سے سولہ سورگ ہیں اور ان کے بعد نروان کی منزل آتی ہے۔ موجودہ یگ میں کوئی انسان (خواہ وہ جین ہی کیوں نہ ہو) نروان حاصل نہیں کر سکتا اور جین دھرم کا یہ مسلم عقیدہ ہے کہ دوسرے مذاہب پر چل کر بھی انسان سولھویں سورگ تک پہنچ سکتا ہے۔

ہر زبان میں بعض ایسے الفاظ ہوتے ہیں جن کے لغوی معنی میں کوئی قباحت نہیں ہوتی لیکن بعض غیر لسانی وجوہ سے ان کے معنی بگڑ جاتے ہیں مثلاً انگریزی میں نیٹو کے لغوی معنی ہیں پیدائشی باشندہ لیکن استعمال میں گورا کالے کو تحقیر کیلیے کہتا تھا۔ ایشیاٹک، نیگرو، وغیرہ ایسے ہی حقارت آمیز الفاظ ہیں جن کے لیے اب Asian, Japanese, African کا استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ مسلم کہ آنجہانی کے لغوی معنی صرف اس دنیا سے گیا ہے لیکن چونکہ یہ لفظ صرف ان لوگوں کیلیے استعمال ہوتا ہے جو خدا کی رحمت کے سزاوار اور دوزخ نہیں سمجھے گئے اس لیے اس لفظ کو غیر جنتی کا ہم معنی سمجھے۔

میں کسی کے عقیدے میں دخل اندازی نہیں کرنا چاہتا۔ آپ مسلمانوں کیلیے بے شک مرحوم کا لفظ استعمال کیجیے اور غیر مسلموں کو مرحوم نہ کہیے لیکن خدا کیلیے اس دل آزار لفظ آنجہانی کا استعمال بھی نہ کیجیے۔ گوتم بدھ، مہاتما گاندھی، نہرو گزر چکے ہیں۔ اگر ان کے نام کے ساتھ آنجہانی کا لقب نہ ہوگا تو بھی کسی کو غلط فہمی نہ ہوگی کہ یہ حضرات زندہ ہیں۔ آخر ہم اکبر، اشوک، شیکسپیئر وغیرہ کے ناموں کو بغیر کسی لقب کے بولتے ہیں اور ان کی مرگ و زیست کے بارے میں کوئی غلط فہمی نہیں ہوتی اس لیے میری گزارش ہے کہ غیر مسلموں کیلیے لفظ آنجہانی کو سرے سے ترک کر دیا جائے۔ مرحوم کے اضافے کی ضرورت نہیں۔ غیر مسلم دوستوں کیلیے جو مقدس حضرات آنجہانی کے استعمال یا جواز پر مصر ہیں وہ اردو کو غیر مسلموں کے دلوں کے پاس نہیں لاتے دور لے جاتے ہیں۔ (گیان چند جین)

نوٹ: آنجہانی اور مرحوم کے موضوع پر بحث کی ابتدا ڈاکٹر گیان چند جین کے استفسار سے ہوئی تھی۔ اب انہیں کے مراسلے پر اس بحث کو ختم کیا جاتا ہے۔ ایسی بحثوں میں بھی اعتدال چاہیے۔ ہم کسی کی نیت پر شبہ نہیں کرتے اور توقع رکھتے ہیں کہ ہمارے محترم ڈاکٹر ایک لفظ کو وجہ نزاع بنا کر دوسروں سے لڑنے نہ جائیں گے۔ ذاتی طور پر ہمارا خیال وہی ہے جو غالب کا ہے ؎

جلاد سے ڈرتے ہیں نہ واعظ سے جھگڑتے
ہم سمجھے ہوئے ہیں اسے جس بھیس میں جو آئے

(ادارہ)

مالک انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ ... نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپوایا اور پبلشر ... حسن نے دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا۔